سب چلیں گے تو چلی جاؤں گی میں بھی ــــــ"

زرقا نے آہستہ سے کہا اور چاولوں کی تھالی لئے اندر سٹور کی طرف چلی گئی۔

شیریں نے معنی خیز نظروں سے لیلیٰ کو دیکھا اور اپنی بہنے ہفا کی زبان میں بولی "اب کس آسانی سے مان گئیں اور بیچارے جیب بھائی مہینے سے منتیں کر رہے ہیں تو ملکہ صاحبہ آج مانتی تھیں نہ کل ــــ"

اس بار مجو جلدی سے شیریں کی طرف بڑھا وہ ستون کے پیچھے ہو گئی اور مجو کے بازو ستون کے گرد حائل ہو گئے لیلیٰ اور شیریں کے زور کا قہقہہ لگاتے وقت جب شیریں غافل ہوئی تو اس کی چوٹی مجو کے ہاتھ آ گئی چوٹی کو جھٹکا دے کر مجو بولا ــــ" یہ جیب مرزا کی کیا بات ہے شیریں ابھی بتاؤ ورنہ..... ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا ــــ"

اسی لمحے لیلیٰ چلائی ــــ" ہائے بڑی لمبی عمر ہے جیب بھائی کی۔ کتنے بھلے وقت تشریف لائے ہیں ــــ"

مجو نے شیریں کی چوٹی چھوڑ دی تو وہ منمنائی ــــ" میرے لئے تو فرشتۂ رحمت بن کر نازل ہوئے ہیں ــــ"

جیب مرزا کے ہاتھ میں دو لفافے تھے۔ اور اُن کی آمد سے چھوٹے سے صحن میں مٹھائی کی ہلکی ہلکی خوشبو آنے لگی تھی۔ انہیں دیکھ کر مجو نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور جلدی سے کہا ــــ" السلام علیکم مرزا"

" مزاج شریف ؟" میرزا نے ذرا تکلف اور سرد مہری سے پوچھا۔

" عین نوازش ہے۔ اپنی سنائیے ؟"

" شکر ہے اس پروردگار کا! کب آئے آپ ؟"

زرقا جیب میرزا کو دیکھ کر ایک بار پھر چولہے کی طرف لوٹ گئی۔ جیب میرزا

نے مٹھائی کے دونوں لفافے تخت پوش پر رکھ دیئے ۔ اور ایک بار باورچی خانے کی طرف نظر دوڑا کر دوبارہ پوچھا۔

" کب تشریف لائے قبلہ ؟"

" بس جی کل ہی آیا ہوں ــــ یعنی ـــــــ کل بعد دوپہر"

" خوب تو ابھی تکان اتر رہی ہے گویا ـــــ "

لیلیٰ جھٹ بولی ـــــ " سفر بھی تو شیطان کی آنت ہے اور گرد ہوتی ہے کوئی راہ میں توبہ توبہ"

مجّو نے باورچی خانے کا رُخ کرتے ہوئے کہا ـــــ " گرد سے مجھے یاد آیا ...... ذرا میرے وہ کپڑے دھلوا دیجئے گا مہربانی سے ـــــ آپ سے کہہ رہا ہوں شیریں بیگم" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لئے باورچی خانے میں وارد ہو گیا۔ زرقا دیگچی میں کفگیر پھیرنے لگی تھی لیکن رک گئی۔ اس نے لمبی لمبی پلکیں اٹھائیں اور ہولے سے مسکرائی۔ اس مسکراہٹ میں اُس کی روح تک شامل تھی۔

مجّو نے ایک چوکی کو اٹھاتے ہوئے پوچھا " یہ چوکی لے جاؤں ؟"

زرقا کی مسکراہٹ اور بھی واضح ہو گئی اور سیپ جیسے سفید دانت جگمگانے لگے اس نے بڑے مبہم انداز میں سر کے اشارے سے اثبات میں جواب دیا اور اس کی طرف تکتی رہی۔

" وہ آپ کے حبیب مرزا تخت پوش پر آبیٹھے ہیں" مجّو نے اس کے قریب جھکتے ہوئے کہا پھر اُس نے چوکی اٹھانے سے پہلے زرقا کا دوپٹہ فرش سے اٹھا کر اس کی گود میں ڈال دیا۔ زرقا یک دم سمٹ کر دیگچی میں کفگیر چلانے لگی اور معظم چوکی پکڑ کر باہر آگیا۔ آج زرقا کو تنہا یوں باورچی خانے میں دیکھ کر اچانک اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ اسے معاً مرزا صاحبان کے معروف بول یاد

آ گئے تھے۔ اور پھر مرزا یار پھر سے کے یاد آتے ہی وہ مسکرا دیا اور اپنے جی ہی جی میں بولا ـــــ "اب خدایا اس میرزا یار سے میری مراد جبیب میرزا نہیں ہے ـــــ"

چوکی لاکر وہ باورچی کی طرف رخ کرکے بیٹھ گیا۔ جبیب مرزا خاموش تھا اور اس کی آنکھوں میں سوچ تھی۔

شیریں نے لیلیٰ سے ـــــ اپنی مخصوص بولی میں کہا "چپ چپ بیٹھے ہیں ضرور کوئی بات ہے ـــــ"

لیلیٰ نے اس کی بات پر پردہ ڈالنے کی خاطر جلدی سے بات کی "آپ کو ہی چوکی لانی تھی۔ مجو بھائی آپ مجھے کہہ دیتے ـــــ" پھر اپنی زبان میں شیریں کو جھڑک کر بولی ـــــ "بیوقوف! تجھے پہلے بھی سمجھایا ہے مٹھائی والے کے سامنے اس زبان میں باتیں نہ کیا کر میرا خیال ہے یہ خوب سمجھتا ہے ـــــ"

شیریں ڈھٹائی سے کہنے لگی ـــــ "تو کونسی بُری بات کہی ہے میں نے بڑی بی؟ ـــــ"

ان دونوں کی بکواس بند کرنے کی خاطر مجو نے جبیب میرزا سے کہا ـــــ "یہاں تو ابھی خاصی گرمی ہے لاہور میں موسم خوشگوار ہو چکا ہے"

"کراچی میں بس دس پندرہ دن گرمی پڑتی ہے۔ اور آپ اتفاق سے اس وقفے میں آئے ہیں۔ کل سے ہوا بند ہے ـــــ"

گگو جبیب میرزا کے پاس مٹھائی کے لفافوں کے پاس بیٹھی سوچ رہی تھی کہ اب کلفٹن جانے کا پروگرام بنے تو کیونکر پھر جب چند منٹ بعد اس نے دیکھا کہ اس پروگرام کے متعلق جبیب میرزا بھی خاموش ہو گئے ہیں تو وہ اٹھی اور لیلیٰ اور شیریں کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ وہ دونوں مسلسل اپنی باتیں کئے جا رہی تھیں

"شیریں باجی ـــــ شیریں باجی؟ ـــــ"

"کیا ہے؟" شیریں نے چڑ کر پوچھا اور پھر لیلیٰ سے بولی "مزہ رہے اگر ابا جی اب کویت سے آ پہنچیں اور پھر سین بندھے فلموں والا ـــــ"

"شیریں باجی ـــــ" ککو پھر منمنائی۔

لیلیٰ نے جھڑک کر کہا ـــــ "تم سے کتنی بار کہا ہے جب بڑے بات کر رہے ہوں تو خاموش رہا کرو ـــــ" پھر وہ شیریں سے بولی ـــــ "توبہ کرو سین کیا بندھے وہ چپ چاپ جلیب میرزا کے حق میں ووٹ دے دیں ـــــ"

"عقلمندی بھی یہی ہے ـــــ"

"شیریں باجی ـــــ" ککو نے اس کا دوپٹہ کھینچ کر اپنی طرف متوجہ کیا۔

"کیا بات ہے۔ کہو ـــــ دوپٹہ کیوں کھینچ رہی ہو ـــــ"

ککو حریص بچے کی طرح شرمساری کے ساتھ بولی ـــــ "جلیب بھائی کہہ رہے ہیں کہ کلفٹن چلیں گے ـــــ"

"واقعی؟" شیریں نے پوچھا۔

"ہاں ـــــ"

"تو پھر تو خوب مزہ رہے گا۔ اتوار کو بور ہونے سے بچ جائیں گے ـــــ" شیریں نے خوش ہو کر کہا۔

"لیکن ـــــ لیکن جلیب بھائی کہتے ہیں اگر زرقا آپا جائیں گی تو....." لیلیٰ نے یکدم اپنی زبان میں چڑ کر کہا ـــــ "ان کی ایسی ذلیل باتوں پر تو مجھے غصہ آتا ہے۔ اور یہ ککو کے ذریعے عرض کرنے کی کیا ضرورت تھی ـــــ"

شیریں بولی "بھئی محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے ـــــ"

"نہیں جی بالکل نہیں ـــــ معاف کیجئے جلیب بھائی آپ بات کریں

ہیں قطع کلام معاف یہ گلّو آپ کا پیام دے رہی ہے مجھے ــــ"

حبیب میرزا نروس ہوگئے اور کروٹ بدل کر بولے ــــ " ہیں صاحب کونسا پیام ؟"

"یہی کہ اگر زکی آپا ساتھ چلیں گی تو کلفٹن چلیں گے ــــ"

حبیب میرزا کا چہرہ گلابی ہوگیا اور وہ جلدی سے کہنے لگا ــ " لو اس میں پیام کی کونسی بات ہے۔ میں تو کہتا ہوں اگر سب چلیں تو لطف آتا ہے۔ اگر تم نہ جاؤ تب بھی بات نہ بنے گی"

آہستہ سے لیلیٰ بولی ــــ "خیر! ــــ"

"یعنی ٹھیک تو کہہ رہا ہوں۔ وہ کسی پکنک میں شامل نہیں ہوتیں۔"

شیریں نے ہولے سے لیلیٰ سے کہا ــــ "اور مزہ پھر کیا خاک آتا ہے تم اچھی بھلی جانتی بھی ہو کیا بات چھیڑ دی"

لیلیٰ نے بلند بانگ کہا ــــ " آپا! زکی آپا! سنیئے ذرا ــــ"

زکی آپا سیاہ دھاریوں والی چست قمیص میں بوسکی کے تھان سا سڈول جسم لئے باورچی خانے کے دروازے میں برآمد ہوئیں۔

"ہوں؟ ــــ"

"حبیب بھائی کہہ رہے ہیں کلفٹن کے لئے ــــ " شیریں نے شہد میں گھلی ہوئی آواز میں کہا۔

"تو پھر چلی جاؤ ــــ"

"آپ نہ جائیں گی کیا؟" لیلیٰ نے پوچھا۔

"میرے سر میں درد ہے ــــ"

"ہائے آپا چلی چلو جی ــــ ہائے آپا ــ" گلّو منت بھرے لہجے میں بولی۔

"تم سب چلے جاؤ نا ـــــ" زکیؔ نے تکلف سے کہا۔
معظم کو احساس ہوا جیسے زکیؔ اُس سے تنہائی میں ملنے کی راہ نکال رہی ہے۔
اس لئے اس نے جلدی سے کہا ـــــ" میں تو جا نہیں سکتا مجھے تو ابھی ابھی انور سے ملنا ہے وہ خواہ مخواہ گلہ کرے گا۔ آپ سب میری وجہ سے نہ ٹھہریئے گا"
گلّو کو جی ہی جی میں خوب علم تھا کہ اگر مجوّ بھائی نہ گئے تو آپا نہ جائیں گی اور اگر آپا نہ گئیں تو ..... تو کوئی نہ جا سکے گا!
اس نے بڑے اصرار سے کہا ـــــ" مجوّ بھائی تو آپ جلدی سے مل آیئے نا انور بھائی سے ہم شام کو چلے جائیں گے کھانے کے بعد ـــــ"
حبیب بھی محسوس کر رہا تھا کہ مجوّ کے بغیر زکیؔ نہ جائے گی ویسے بھی زکی کو گھر پر چھوڑ کر جانے کے لئے وہ تیار نہ تھا۔ کوئی بھی انور کے پاس اتنی دیر بیٹھا نہیں رہ سکتا خاص کر جب اچھی طرح علم ہو کہ زکی گھر اکیلی بیٹھی ہے اور سب سیر پہ گئے ہیں!
اس نے جلدی سے کہا۔" دوپہر کو وہاں ویسے بھی لطف نہیں آتا۔ میں مٹھائی لے آیا ہوں وہاں چل کر چائے پئیں گے ـــــ"
" پہلے اماں سے تو مشورہ کرلیں۔ خواہ مخواہ کے خیالی پلاؤ پک رہے ہیں ـــــ"
لیلیٰ نے غسلخانے کا رخ کرتے ہوئے کہا۔
" واقعی! ـــــ" حبیب میرزا بولے۔
غسلخانے میں ڈبّے کے ساتھ جسم پر پانی ڈالنے کی آواز بند ہو چکی تھی لیلیٰ نے پٹ کے ساتھ چہرہ لگا کر اونچے سے کہا ـــــ" اماں! ـــــ"
" ہاں ـــــ" اندر سے بھاری آواز آئی۔
" اماں حبیب بھائی آئے ہیں"

"تو بٹھاؤ انہیں ـــــ مجو کو بتا دو وہ ان سے باتیں کرے گا"

"اماں باہر جانے کا پروگرام بن رہا ہے آپ جلدی نکلیں ہاں ـــــ"

"اچھا اچھا آ رہی ہوں دو منٹ آرام سے نہا تو لینے دیا کرو ـــــ"

تھوڑی دیر بعد اماں نہا کر نکلیں تو ان کی گلابی اور سفید جلد سے انگریزی صابن کی خوشبو بھبکے بن کر پھوٹ رہی تھی۔ ماتھے کے اردگرد کھچڑی پکے بالوں کی جھالر بھیگی ہوئی تھی۔ موٹی گردن پر چھوٹا سا جوڑا ڈھیلا ہو کر لٹک رہا تھا۔ انہوں نے سفید ململ کی قمیص پہن رکھی تھی اور موٹا سا سفید پیٹ اس کے پیچھے پیلا سا نظر آتا تھا۔ کھڑاویں بجاتی وہ آ کر تخت پوش پر بیٹھ گئیں "ارے شیریں! وہ میرا پاندان تو لانا ـــــ"

"اماں! اماں جی حبیب بھائی کہہ رہے ہیں کہ سب کلفٹن چلیں ـــــ"

اماں نے اس کی طرف تیکھی نظروں سے دیکھ کر کہا ـــــ "اچھا تو سوچتے ہیں اس بارے میں ـــــ لیکن کیا پہلے کبھی نہیں گئی وہاں ـــــ ندیدی!"

حبیب میرزا نے مٹھائی کے لفافے اماں کی طرف سرکاتے ہوئے کہا ـــــ جی میرا ارادہ تھا کہ وہاں چل کر کچھ اتوار منایا جائے چائے وائے کا شغل ہو ـــــ"

اسی اثنا میں رانی بھاگتی بھاگتی اندر آئی اور آتے ہی بولی ـــــ "مجو بھائی! مجو بھائی!"

"کیوں ـــــ کیوں ـــــ کیوں؟" مجو نے پوچھا۔

"آپ کا فون ہے مجو بھائی ـــــ"

"آپ نے فون کب لگوایا اماں ـــــ"

اماں نے فون کب لگوایا اماں ـــــ" رانی نے نقل کے انداز میں کہا۔

اماں نے افسردگی سے کہا ـــــ "ارے ہمارے ہاں فون کہاں یہ پاس والوں

کے گھر فون آیا ہوگا۔"

"چلو بھئی چلیں رہبری کرو گی؟" مجو نے رانی سے پوچھا۔

"یہاں سے جانے کی ضرورت نہیں ابھی وہاں وارد ہو جاتے ہیں"

"ارے یہاں سے نہ جا کم بخت دو سیڑھیاں اترے گا مجو تو تھک نہیں جائے گا۔"

آماں چلائیں۔

لیکن رانی نے سٹور سے دیوار تک جانے والی پارٹیشن کا تختہ اس اثنا میں ادھیڑ لیا اور دوسری طرف جانے کی راہ بن گئی۔

دوسرے لمحے دھاری دار نائٹ سوٹ پہنے مجو چیتے کی طرح ساتھ والے فلیٹ میں داخل ہو گیا۔

٭ ٭ ٭

ٹرام میں بیٹھ کر مجو سوچ رہا تھا کہ انور بھی کیا چیز ہے؛ خوب جانتا تھا کہ میں آیا ہوا ہوں۔ یہ بھی جانتا تھا کہ میں اُسے کس سلسلے میں فوراً ملنا چاہتا ہوں لیکن پھر بھی وکٹوریہ روڈ کے اس ریستوران میں انتظار کرنے کے بجائے وہ منوڑا چلا گیا۔ اور اگر اُسے انتظار نہ کرنا تھا تو بھلا فون کرنے کی کیا ضرورت تھی ——

"ابھی منوڑا پہنچو —— میں تمہاری راہ دیکھوں گا ——" انور نے فون پر کہا تھا۔

"بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہارا منوڑا —— میں اتنی دور سے آیا ہوں اور تم نے مجھے ملنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی۔"

یہ سُن کر انور نے فون بند کر دیا تھا۔

پہلے تو مجو کے جی میں آئی کہ وہ انور کے تعاقب میں نہ جائے۔ لیکن پھر اُسے

یاد آیا کہ اس کی جیب میں کل دس روپے باقی ہیں۔ اور گھر پہ کلفٹن جانے کا پروگرام بن رہا تھا۔ اس معاملے میں وہ حبیب میرزا کا کفیل نہ ہونا چاہتا تھا۔ انور کم بخت کو بھی ہمیشہ اپنی ہی سوجھتی ہے۔ لمحہ بھر کے لئے کسی اور کے آرام کا خیال ہی نہیں آتا!

کم بخت انور! اور انور کا چہرہ معظم کے ذہن میں چکر لگانے لگا۔

درمیانے قد کا آدمی ——— رنگ نہ سانولا نہ صاف عجب مٹی، چونے، اور بجری کے مرکب سے بنی ہوئی رنگت تھی۔ چہرے پر موٹے موٹے شیشوں کی عینک تھی جس کے پار آنکھیں نظر ہی نہ آتی تھیں۔ دائیں طرف سے مانگ نکالتا تھا۔ لیکن بال اس قدر کم اور ماتھا اس قدر چوڑا تھا کہ مانگ بے نکلی سی لگتی تھی۔ کراچی میں ایک بدیسی فرم کا نوکر تھا اور اچھی خاصی تنخواہ پاتا تھا۔ لیکن قمیص ہمیشہ بغیر استری کے پہنتا تھا۔ اس جیسے کئی آدمی اس کراچی شہر میں آباد تھے لیکن معظم کے لئے انور انور ہی تھا۔

اور آج ——— آج کلفٹن جانے کا پروگرام بن رہا تھا اور اُس کے پاس صرف دس روپے تھے!

گڑگڑاتی شور مچاتی ٹرام بندر روڈ پر ہچکورے لیتی جاتی تھی اس سے پہلے وہ کراچی دو بار آیا تھا لیکن ٹرام میں چڑھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ اس بار بھی وہ خالہ کے فلیٹ سے چل کر بہت دور تک بندر روڈ پر پیدل ہی چلتا آیا تھا۔ اُسے یوں لگتا تھا۔ فلیٹ کی ایک کھڑکی میں سے گلناری پردے کے پیچھے سے دو لمبی لمبی آنکھیں اُسے دیکھ رہی تھیں۔ ان آنکھوں کی دور مار روشنیوں میں وہ کسی سائیکل رکشا، بس یا ٹرام میں سوار نہ ہونا چاہتا تھا۔

ٹرام میں گھس کر اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑا کر ہمسفروں کا جائزہ لیا وہاں کوئی

بھی لاہور کا باشندہ نہ تھا۔ کراچی کے متوسط اور غریب طبقے کے لوگ سوار تھے ایک سے ایک لمبی کار فراٹے بھرتی قریب سے گزر رہی تھی اور زیادہ تر ان میں بدیسی ملکوں کے سرخ و سپید چہرے بے نیازی سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ ٹیکسیاں وکٹوریائیں اونٹ گاڑیاں، گدھا گاڑیاں سائیکل رکشائیں اور موٹر سائیکل رکشائیں سبھی اس کراچی شہر میں بغیر شرمائے ایک دوسرے کے ساتھ رواں دواں تھیں۔

جس ٹرام میں وہ سوار ہوا تھا وہ بولٹن مارکیٹ کے قریب جا کر رک گئی اور اسے اتر کر بس لینا پڑی۔ ساڑھے دس کا وقت ہو چلا تھا۔ اور اسے رہ رہ کر انور پر غصہ آ رہا تھا۔ جو خواہ مخواہ انفرادیت دکھانے کی خاطر منوڑا جا بیٹھا تھا۔ اگر اس کی جیب میں دس سے زائد روپے ہوتے تو وہ پیر کے روز انور سے ملتا اور وہ بھی اس کے دفتر میں۔ لیکن اب تو اُس کی عزت کا سوال تھا۔

بس کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ معظم پچھلی لمبی سیٹ پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا اگر انور نے مجھے پیسے نہ دیئے تو کراچی کے قیام کا کیا بنے گا۔ اس کے مستقبل کا کیا بنے گا اور شام کو کلفٹن کے پروگرام کا کیا بنے گا ——

فضا میں چمڑے اور باسی پانی کی خوشبو تھی۔ دور سے ہی سمندر میں ٹھہرے ہوئے دو لمبے چوڑے جہاز نظر آ رہے تھے۔ ان کے گرانڈیل وجود پر سورج کی تیکھی کرنیں اور بھی اجاگر ہو رہی تھیں۔ اور معظم کو احساس ہو رہا تھا جیسے یہ ماحول لاہور سے قطعی مختلف ہو۔ بس سے اتر کر وہ سیدھا اس طرف بڑھا جہاں سے موڑ لانچ اور عام بیڑے منوڑے جاتے تھے۔ ابھی وہ جنگلے تک پہنچا ہی تھا کہ اس کے سامنے لوگوں سے لدا پھندا ایک بیڑا رخصت ہو گیا۔ وہ دونوں کہنیاں ٹیک جنگلے پر ٹکا کر دوسرے بیڑے کا انتظار کرنے لگا۔

موٹر لانچ والے امیر مسافروں کو ورغلا رہے تھے۔ عام بیڑے والا زنانی اور مردانی سواریاں بانٹ بانٹ کر بٹھانے میں مشغول تھا۔ ٹھہرے پانی پر جھاگ کے بلبلے کاغذوں کے ٹکڑے اور گلے سڑے پتے ڈولتے پھر رہے تھے۔

بیڑے والے کا دبلا پتلا سیاہ جسم دھوپ میں چمک رہا تھا۔ اس کی میلی آنکھیں سمندر کی لہروں کا عادی چہرہ اور ہوا میں اڑتے ہوئے بالوں نے اسے بحری قزاق کی شکل دے رکھی تھی۔ معظم سے کچھ دور ہٹ کر ایک امریکی جوڑا سالم لانچ لینے کے بعد اس میں اتر رہے تھے۔ میاں بیوی نے ایک سے کپڑے پہن رکھے تھے آدھی آستینوں کی گہری پیلی قمیصیں اور چھوٹی چھوٹی نیلی نکریں، قمیصیں کولہے تک بھی نہ پہنچتیں تھیں عورت کے بال بالکل چھوٹے چھوٹے تراشے ہوئے تھے اور اس نے بھی شوہر کی طرح گلے میں کیمرہ اور تھرموس لٹکا رکھی تھی۔ جب چھک چھک پھک پھک کرتی پانی کے چھینٹے اڑاتی لانچ کچھ دور چلی گئی تو وہ دونوں امریکی میاں بیوی دو توام بھائی نظر آنے لگے اور آہستہ آہستہ یہ پیلا سا دھبہ اور موٹر لانچ کا سبز جھنڈا موڑ کاٹ کر سمندر کی نیلی سطح پر دور ہوتا چلا گیا۔

جب بیڑے والے نے آخری نعرہ لگایا کہ "اب لانچ چلے گا جی ——"
تو معظم سیڑھیاں اتر کر بیڑے میں بیٹھ گیا۔

بیڑے والے کے ساتھی نے موٹی سی رسی جنگلے سے کھولی اور بیڑے کو آہستہ سے دھکا دیا۔ معظم نے سگریٹ سلگایا اور خاموشی سے بندرگاہ میں رکے ہوئے خوبصورت جہازوں کو دیکھنے لگا۔ اس کی پشت کی جانب ایک کراچی والی اپنی نووارد سہیلی سے کہہ رہی تھی؛ وہ دیکھا تم نے جہاز؛ کتنا بڑا ہے۔ یہ سفید والا تو نیوی کا جہاز ہے تم

ogspot.com

"نیوی؟ وہ کیا ہوتی ہے آپا؟ —"

"ارے نیوی نہیں جانتیں؟ ہماری بحری فوج۔ منوڑا تو دراصل ان نیوی والوں نے بسا رکھا ہے — ارے وہ دیکھو — وہ نیوی والوں کی کشتی — یہ کسی جہاز کو لینے چلے ہیں —"

"کہاں؟ — کہاں؟"

"وہ دیکھو — سفید لانچ"

معظم نے بھی کنکھیوں سے اس لانچ کی طرف دیکھا۔ لوہے کے بڑے سے بوائے کے قریب نیوی کی لانچ چھینٹے اڑاتی گزر گئی۔ اس لانچ میں ایک آدمی تو بالکل ایسا سوار تھا جیسے دیکھ کر نیوی کٹ سگریٹ پر بنے ہوئے کپتان کی شکل یاد آتی تھی۔

"آپا — آپا یہ لوہے کے بڑے سے ٹماٹر کیا تیرتے پھر رہے ہیں؟"

معظم نے چہرہ موڑ کر سوال پوچھنے والی کی طرف دیکھا اور وہ اپنی کم علمی پر شرما کر دوسری طرف دیکھنے لگی آپا نے بڑے فخر سے کہا — "ارے یہ بوائے ہیں، جہازوں کو راستہ دکھانے کے لئے"

"تو لہروں میں بہہ نہیں جاتے کیا؟"

"بہہ کیسے جائیں — نیچے اتنے موٹے موٹے زنجیروں سے بندھے لنگر جو ہوتے ہیں —"

معظم ایک نیلے رنگ کے بڑے سے جہاز کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے بھی مڑ کر بوائے پر نظر ڈالی حدِ نظر تک بندرگاہ سے کچھ فاصلہ پر بوائز کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ لوہے کے بڑے بڑے کنڈے تھے اور نیچے سے یہ لوہے کی بھاری بھرکم زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے۔ نیوی والی لانچ سمندر کی طرف بہت

دور جا نکلی تھی اور اب یوں لگتا تھا۔ جیسے پانی کی سطح پر ایک رومال کا ٹکڑا ڈوبنے سے پہلے تیر رہا ہے۔ سمندر میں بہت آگے بادبانی کشتیاں غوطے کھاتی نظر آتی تھیں۔ انہیں دیکھ کر معظم کا جی چاہا کہ کاش کسی چاندنی رات میں وہ اور زرقا ایک ایسی ہی کشتی میں بیٹھ کر سمندر میں بڑھتے چلے جائیں۔ گہرے پانی کی سیاہ سطح پر چاندی جیسی لہریں ابھریں اور پارے کے چھینٹے کشتی کے کناروں سے ہو کر ان کی گود میں آ گریں۔ زرقا خوف اور وفورِ جذبات سے گھبرائی ہوئی اس سے چمٹی بیٹھی ہو اور دور دور تک ماہی گیر کے نغمے کے سوائے اور کوئی شور نہ ہو ــــــ صرف پانی کا مدھم ساز اور ماہی گیر کی بھری بھری آواز ــــــ"

"وہ نیوی والا لاؤنج کہاں گیا آپا؟ ــــــ" اسی پنجابی لڑکی نے دوبارہ پوچھا۔

"سمندر میں جہاز لینے گیا ہے شاید؟"

"کیوں جہاز کیوں لینے گیا ہے جہاز خود نہیں آ سکتا کیا؟"

"آ تو سکتا ہے لیکن دستور یہی ہے کہ غیر ملکی جہازوں کو بندرگاہ کی نیوی کے پائیلٹ لائیں۔"

جہازوں کو بندرگاہ سے نکالنے والا ایک دقیانوسی پرانا جہاز تھوڑی دور آہستہ آہستہ جا رہا تھا اُس کے ماتھے پر دھکا لگانے کی بڑی سی گدی بندھی تھی۔

مسافروں کا لاؤنج آباد جزیرے پر جا پہنچا۔ بیڑے والے نے جلدی سے نکل کر بیڑے کی رسّی جنگلے سے باندھی اور مسافر اترنے لگے۔ سیڑھیاں چڑھ کر معظم نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی لیکن انور کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا البتہ پُل کے پاس لوگ جھکے ہوئے سمندر کے دو تیراکوں کو دیکھ رہے تھے۔ انور کی تلاش میں معظم بھی ان لوگوں کی طرف بڑھا۔ دو تین نوجوان لڑکے سمندر میں تیر رہے تھے۔ تماشائی پُل پر سے اکنّی دوّنی پھینکتے اور وہ ڈبکی لگا کر اسے ڈھونڈ لاتے اور یہی

اکنیاں دونیاں ان کی مشقت کا محنتانہ بن جاتیں۔

معظم نے غور سے سارے تماشائیوں کو دیکھا۔ انور کی نوعیت کا ایک بھی شخص اسے نظر نہ آیا۔ اس نے دوسرا سگریٹ سلگایا اور آہستہ آہستہ منوڑا کی اس پکی سڑک پر چلنے لگا جو سمندر کی طرف سے اوپر جاتی ہے۔

منوڑا کے بازار سے پہلے جہاں بقول کراچی والوں کے بہت سے بوائے پڑے ہوئے تھے معظم تھوڑی دیر کے لئے رکا۔ اسے خیال آیا کہ حبیب میرزا کو گھر چھوڑ کر آنا عجیب حماقت تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ زرقا کی محبت مجھے ایک ایسے

سمندر میں تنہا چھوڑ گئی ہے جہاں ایک بھی تو بوائے نہیں ایک بھی تو لائٹ ہاؤس نہیں جو راہ دکھائے۔ اس سمندر میں ٹامک ٹوئیاں مارتا میرا جہاز کہاں سے کہاں نکل آیا ہے اور ابھی تک زرقا کسی لانچ پر چڑھ کر مجھے بچانے ہی نہیں آئی۔ وہ تو ساحل کا وہ پکا جنگلہ بن گئی ہے جس سے کشتیوں کے رسے بندھتے ہیں جس کے سہارے ایک عالم اترتا چڑھتا ہے لیکن جو جہاز کے خیر مقدم کو اپنی جگہ چھوڑ کر آگے نہیں بڑھتا ـــــ زرقا کی اس ادا پر اسے غصہ آگیا اور اس غصے کو انور پر اتارنے کے لئے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا جلدی جلدی سمندر کی طرف بڑھنے لگا

تھوڑی سی چڑھائی چڑھ کر جب سمندر کی ریت نے اس کے پیروں کو چھوا تو اسے انور کی شکل نظر آئی۔ وہ سمندر کنارے بنے ہوئے معمولی سے ریستوران کی طرف جا رہا تھا۔ معظم نے منہ پر ہاتھ رکھ کر بڑے زور سے آواز دی ـــــ

"انور ـــــ انور ـــــ!!"

لیکن سطح سمندر پر ٹوٹتی لہروں کے شور میں یہ آواز دب گئی۔

روغن اتری ہوئی کرسیاں ایک طرف کرتا انور ریستوران کے اندر داخل ہو گیا۔

اور معظم اس کے تعاقب میں لپکا۔

سمندری ہوائیں یہاں کی ہر چیز اڑانے لئے جا رہی تھیں۔ صرف کاؤنٹر کے نیچے شیشے کی بند الماری میں پڑے ہوئے کیک، رسک اور نمکین بسکٹ محفوظ تھے ورنہ ریستوران کے بوسیدہ پردے لوگوں کے کپڑے اور ساحل کے قریب پھیلی ہوئی ریت کے ذرّے سب تیزی سے اڑے جا رہے تھے۔ انور کیبن کی کھڑکی کے سامنے بیٹھنے والا ہی تھا کہ معظم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا

"یہ کیا تک ہے حرامی۔ سیدھی طرح کسی ریستوران میں نہیں مل سکتے تھے کیا ——؟"

"مزاج شریف؟" انور نے ہاتھ مصافحے کے لئے بڑھا کر پوچھا۔

"یہ اپنی حرمزدگیاں رہنے دے اور سیدھی طرح میری بات کا جواب دے"

"بیٹھئے تو سہی جنابِ من —— یہاں کھڑکی کے سامنے گولوہے کی سلاخوں کا جنگلا ہے لیکن آپ کو قید کا احساس نہ ہوگا۔ سامنے سمندر کی تیز ہواؤں کا لطف اور امڈتی لہروں کا منظر صاف نظر آتا ہے ——"

"تجھے ہو کیا گیا ہے؟" معظم نے پوچھا۔

"مجھے!" —— انور نے سلاخوں والی کھڑکی کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا —— "مجھے؟"

"ہاں تجھے ——"

"کسی دانشور نے کہا ہے دنیا میں دو طرح کے بیوقوف ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو کبھی محبت نہیں کرتے اور ایک وہ جو ایک بار محبت کرنے کے بعد دوسری بار بھی اس جرم کا ارتکاب کرتے ہیں، میرا شمار اس دوسری قسم میں ہوتا ہے ——"

معظم نے رومال سے لوہے کی کرسی جھاڑی اور اس پر بیٹھتے ہوئے پوچھا ——

"لیکن یہ بے وقوفی آخر کس شوق میں کی ہے ——"

انور نے بڑے آرام سے سگریٹ سلگایا دو ایک کش لئے اور پھر بولا —— "اس کاروباری شہر میں جہاں زندگی لین دین حساب کتاب اور جمع کھاتا بن گئی ہے وہاں ایسی بیوقوفی ضروری ہوتی ہے ——"

اسی اثنا میں ریستوران کا مالک آگیا اور انور نے کہا —— "قبلہ چائے بھیجئے سٹرونگ سی —— دیکھئے یہ پنجاب سے آیا ہے اسے کوئی شکایت نہ ہونے پائے ——"

"بے فکر رہیئے" —— مالک جانے لگا۔

"دیکھئے سٹرونگ چائے ہو —— زبان جلانے والی —— لب سوز"

"فکر نہ کیجئے صاحب ——" مالک چلا گیا۔

سلاخوں والی کھڑکی میں سے سمندر صاف نظر آرہا تھا دن کی کڑکتی دھوپ میں دور سمندر کی سطح پر بھاپ اڑاتا ایک چھوٹا سا جہاز نقطہ بن کر کھڑا تھا۔ اور اسے دیکھ کر معظم کو احساس ہوتا تھا جیسے وہ نقشے کی کاپی پر بنایا ہوا جہاز ہے ایسا جہاز جسے دکھا کر ماسٹر جی کہا کرتے تھے دیکھو جب تم سمندر کنارے ہوتے ہو تو پہلے جہاز کے مستول نظر آتے ہیں پھر چمنی..... پھر اس کا جنگلہ اور دھڑ نظر آتا ہے — اگر دنیا گول نہ ہوتی تو سارا جہاز ایک ہی بار نظر آجاتا!

"اور آپ کیا سوچ رہے ہیں حضرت؟" انور نے اسے کھڑکی سے دور افق کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ تم ٹھیک کہتے ہو لیکن تمہاری بات میں ذرا سی ترمیم مطلوب ہے۔ بیوقوف دراصل تین قسم کے ہوتے ہیں۔ دو قسمیں تو تم نے بیان کی اور تیسری قسم اُن عاشقوں کی ہے جو بغیر کچھ حاصل کئے چاہتے چلے جاتے ہیں

"محبت میں کچھ حاصل کرنے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟" انور نے چمک کر پوچھا۔
معظم نے سگریٹ کے ٹکڑے کو پیروں تلے مسلا اور پھر دونوں بازو اپنے اور انور کے درمیان دھری ہوئی میز پر رکھ کر بولا ——— "تم ابھی نوگرفتار ہو۔ محبت کی اس سٹیج پر خالی محبت کا نشہ ہی بہت ہوتا ہے۔ ہولے ہولے جب نظر کی منزلیں طے ہو جائیں گی مسکراہٹوں کے خزانے ختم ہو جائیں گے میٹھی میٹھی باتوں کا خمار اتر جائے گا تو محبت ہل من مزید کا نعرہ لگائے گی۔ محبت کی آگ ایسی ہے جس میں کچھ نہ کچھ جھونکتے ہی رہنا پڑتا ہے ———"

"بالکل! ——— انسان اپنا خون جگر جلاتا ہے اپنے آنسوؤں کی شمع روشن کرتا ہے"

انور نے جوش میں آکر کہا۔

"ابھی تم محبت کی پگڈنڈیوں پر نکلے ہو شاہراہ پر پہنچو گے تو تمہیں علم ہوگا مجھے تو اس شاہراہ پر چلتے پانچ سال ہو چکے ہیں۔ اور اب..... اب خط لکھتے لکھتے طبیعت تھک گئی ہے۔ پرانی یادوں کے سہارے جینا مشکل ہو گیا ہے ..... بہت مشکل....."

"عجیب احمق آدمی ہو تم بھی یار ——— زرقا تمہیں چاہتی ہے تم زرقا کو چاہتے ہو۔ رشتہ دار ہو ملنے ملانے میں کوئی چیز حائل نہیں ———"

"میں میل ملاقات کو اپنے لئے دار و رسن کی آزمائش سمجھتا ہوں" معظم نے کرب بھرے لہجے میں کہا اتنی ساحل کنارے لہریں نہ تھیں جتنی سلوٹیں اس کے ماتھے پر پڑ گئیں۔

ہوٹل کا مالک ایک گندی سی ٹرے میں ہاف سیٹ چائے اور کیک کے چند ٹکڑے لے آیا۔ گجراتی ٹی سیٹ کی پیالیوں میں بال آچکے تھے اور ان کی

اندرونی سطح پر چیچک کے داغ ابھر آئے تھے۔ چائے کا ذائقہ جوشاندے کی مانند تھا اور لگتا تھا جیسے سمندر کے ساحل پر پانی اُبلنے میں ہی نہیں آتا۔

"عجب چیز نکلی یہ چائے؟" معظم نے کہا۔

"سمندر کنارے کی چائے ہے صاحب۔ ذرا سوچو اس منوڑے پر ایک بھی گھر آباد نہ ہو۔ تم اور میں ایک کشتی پر تھکے ہارے یہاں آئیں اور یہاں پہنچ کر یہ پیالہ چائے کا ہمیں ملے ——— ہم دونوں ہی اس پر جھپٹ پڑیں ——— بولو اب ذائقہ کیسا ہے!"

"نہایت اچھا روح پرور اور سکون بخش! ———"

انور نے کیک اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ——— "لو کیک کھاؤ۔ نہایت نفیس ہوتا ہے یہاں کے لوگ اس میں گھی مکھن نہیں ڈالتے ان کا کوئی اپنا ہی فارمولا ہے۔ لیکن ہے بیحد اعلیٰ ———"

"میں شکریہ ———" معظم نے ماچس جلائی لیکن سمندری ہوا میں ماچس کا شعلہ ٹھہر نہ سکا اور اس نے میز تلے جھک کر سگریٹ سلگایا۔ اور بولا ——— "میری محبت کے سامنے میرا وجود بھی بالکل اس شعلے کی طرح ہے۔"

انور نے ہنس کر کہا ——— "جیسے یہ کوئی نئی بات ہے ہر انسان اپنے آپ کو جھکڑ اور آندھی سے مقابلہ کرتے ہوئے محسوس کرتا ہے لیکن بعد میں حقیقت کی آنکھ کھلنے پر اُسے بڑا دکھ ہوتا ہے کہ وہاں نہ جھکڑ تھا نہ آندھی۔"

معظم نے میز پر رکھے ہوئے ہاتھ کو بھینچ کر ہولے سے مکا مارا اور بڑے جوش سے بولا ——— "میں اس رومان سے تھک گیا ہوں اب میرا بند بند دکھنے لگا ہے ——— انور! میرا جی چاہتا ہے..... میرا جی چاہتا ہے کہ زرقا کو سینے سے لگا کر اپنے اتنے قریب کر لوں کہ..... کہ میرا جسم اس کے وجود

میں تحلیل ہو جائے ——"

"میں اتنے قرب کا قائل نہیں ——"

"میں نے بھی خطوں میں کبھی اس تمنا کا اظہار نہیں کیا۔ لیکن ..... لیکن ——"

"تم نے اس کا ذکر کبھی زرقا سے نہیں کیا؟" انور نے پوچھا۔

"وہ ہمیشہ اپنی بہنوں میں گھری رہتی ہے۔"

"تو کسی خط میں ہی لکھ دیتے؟"

"سنسر ہو جانے کا خدشہ رہتا ہے ——"

"تو سیدھی طرح اماں جی سے بات کیوں نہیں کرتے؟ کہ اب تاب انتظار نہیں"

"میری امی نے خط لکھا تھا ——"

"پھر؟ ——" انور نے پوچھا۔

"دراصل زرقا کی ماں یعنی میری خالہ کچھ جانچ تول رہی ہیں۔ وہ ابھی کسی فیصلے پر پہنچ نہیں پائیں ایک طرف حبیب میرزا ہے —— اور ....."

انور نے جلد سے کہا "یار یہ حبیب میرزا کیا چیز ہے؟"

"میں خود سوچ رہا ہوں ——"

پتہ نہیں میں اسے کیا سمجھوں، سلائی یا کھمبا؟

"میرا واقف ہے ....."

"خیر ایسا دبلا پتلا بھی نہیں ——" معظم نے کہا۔

"تم خود کون سے پتے والے پٹھان ہو ——"

"کیا مطلب؟"

انور نے ہنس کر کہا۔

"میرا نام عبدالرحمان
پشتے والا میں ہوں پٹھان"

"اور تو کیا ہے" معظم نے بے تکی بات کی۔

"خیر میرا تو اس سلسلے میں ذکر کرنا ہی فضول ہے دوڑ تو تم دونوں میں ہو رہی ہے بیچاری لڑکی گھوڑوں کی ریس میں ٹٹو پر داؤ لگا بیٹھی ——"

"بخدا انور مذاق کی بات نہیں میں بیحد سنجیدہ ہو رہا ہوں ——"

"اور یہاں کسے مذاق سوجھ رہا ہے کم بخت؟ اپنی بھی تو جان پر بنی ہے ورنہ کون منوڑا آتا؟"

معظم نے مسکرا کر پوچھا —— "کیوں کیا وہ یہاں آئے گی؟"

"ایک روز آئی تھی بس اسی دن سے ہر اتوار منوڑے کو سلام کرنے آتا ہوں ——"

معظم نے کرسی کی پشت سے سر لگا لیا اور آہ بھر کر بولا —— "محبت کی یہ سٹیج بڑی پیاری ہوتی ہے۔ اس میں خودکشی کرنے کا خیال آتا ہے ٹرین تلے مر جانے کا سودا ہو جاتا ہے ستاروں سے محبت ہوتی ہے پھولوں کی خوشبوئیں دل کو لبھاتی ہیں —— لیکن کوئی بھی تو نہیں مرتا —— کیونکہ محبت ہمیشہ ہل من مزید کا نعرہ لگاتی ہے کم از کم محبت کی اس خمار آور منزل پر سبھی مرنے کے خواب دیکھتے ہیں کوئی جان نہیں دے سکتا مجھے تم پر رشک آ رہا ہے انور ——"

انور نے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر کہا —— "اور میں تمہیں دیکھ کر حسد کی آگ میں جلا جا رہا ہوں —— بھلا ایسی محبوبہ آج کہاں ملے گی جو شادی کا مطالبہ نہ کرے؟ جو مرد کو اپنی بدی کے شکنجے میں جکڑنا نہ چاہے؟"

"لیکن ایسی محبوبہ کا فائدہ بھی کیا ہوتا ہے آخر؟" معظم نے پوچھا۔

kitaabiyat.bl